تنہا تنہا

احمد فراز

تنہا تنہا

احمد فراز

تنہا تنہا

احمد فراز

جملہ
حقوق
محفوظ

ملنے کا پتہ

یوسف پبلشرز

بینک روڈ۔ راولپنڈی۔ صدر

مصنّف : احمد فراز

پبلشر : محمد یوسف

پرنٹرز : ٹی-ایس-پرنٹرز- راولپنڈی

قیمت :

ادارہ : یوسف پبلشرز- بینک روڈ- راولپنڈی- صدر

کتابت : محمد صدیق منظر تلمیذ یوسف نگینہ

"قلمکار" - اخبار مارکیٹ- کالج روڈ- راولپنڈی

ضیاءُ الدّین ضیاءؔ

کے نام

ہاں، مگر کوئی تمنّا پسِ دامانِ وفا
مجھ سے پوشیدہ مرے پیشِ نظر ہوتی ہے

(ضیاء)

ترتیب

۱۔ شاعر ۲۱

۲۔ رباعی ۲۶

۳۔ تیری باتیں ہی سنانے آئے ۲۷

۴۔ جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد ۳۰

۵۔ کھنڈر ۳۲

۶۔ کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں ۳۸

۷۔ بھول ۴۰

۸۔ رباعی ۴۲

۹۔ فرار ۴۳

۱۰۔ دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمن جانِ بہار ۴۵

۱۱۔ احتساب ۴۷
۱۲۔ ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوالی ہے ۴۹
۱۳۔ ہر شاخ چمن کی جل رہی ہے ۵۱
۱۴۔ آگ ۵۳
۱۵۔ رباعی ۵۶
۱۶۔ بانو کے نام ۵۷
۱۷۔ مجسّمہ ۶۰
۱۸۔ نشۂ گیسوئے شبِ تاب کہاں ۶۳
۱۹۔ کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی ۶۶
۲۰۔ مسیحا ۶۸
۲۱۔ تشنگی ۷۰
۲۲۔ گوارا بھی سہی جو دُکھ ترے ہیں ۷۳
۲۳۔ کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے ۷۵
۲۴۔ اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں ۷۷
۲۵۔ رباعی ۷۹
۲۶۔ رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے ۸۰
۲۷۔ ان کے وعدوں پہ یقیں لوگ بھی دیوانے ہیں ۸۲
۲۸۔ ایبٹ آباد ۸۴
۲۹۔ تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا ۸۷
۳۰۔ ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے ۸۹

۳۱۔ طلسمِ ہوشربا ۹۲
۳۲۔ سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اُٹھائیں بھی ۹۶
۳۳۔ وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے ۹۸
۳۴۔ انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چپ ہیں ۱۰۰
۳۵۔ خریدار ۱۰۲
۳۶۔ رباعی ۱۰۳
۳۷۔ خیر مقدم ۱۰۴
۳۸۔ اے بھُوک کی مخلوق ۱۰۹
۳۹۔ قافلے گزرے ہیں زنجیر بہ پا ۱۱۲
۴۰۔ رباعی ۱۱۴
۴۱۔ قاتل کے قصے مقتل کی باتیں ہیں ۱۱۵
۴۲۔ چند نادان، چند دیوانے ۱۱۷
۴۳۔ کس قدر آگ برستی ہے یہاں ۱۱۹
۴۴۔ ہر ہم سفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو ۱۲۱
۴۵۔ کٹھن ہے راہگزر تھوڑی دور ساتھ چلو ۱۲۳
۴۶۔ تختیٔ ۱۲۵
۴۷۔ ایک منظر ۱۲۸
۴۸۔ رباعی ۱۳۰
۴۹۔ اس ادا سے کبھی آ کر گزرو ۱۳۱
۵۰۔ دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو ۱۳۵

۵۱۔ منسوبہ سے	۱۳۸
۵۲۔ جب بھی دل کھول کے رُوئے ہوں گے	۱۴۲
۵۳۔ معذرت	۱۴۴
۵۴۔ رباعی	۱۴۸
۵۵۔ اُداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں	۱۴۹
۵۶۔ کچھ نہ کسی سے بولیں گے	۱۵۱
۵۷۔ سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں	۱۵۳
۵۸۔ صرّاف	۱۵۵
۵۹۔ منصور	۱۵۹
۶۰۔ رباعی	۱۶۵
۶۱۔ مشورہ	۱۶۶
۶۲۔ غیر سے تیرا آشنا ہونا	۱۶۹
۶۳۔ رباعی	۱۷۱
۶۴۔ تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ	۱۷۲
۶۵۔ آگ میں پھول	۱۷۴
۶۶۔ رباعی	۱۷۷
۶۷۔ میری حالت ہے کہ احساسِ طرب ہے کوئی	۱۷۹
۶۸۔ اب جو کانٹے ہیں دل میں تمناؤں کے پھول تھے	۱۸۱
۶۹۔ سکوتِ شامِ خزاں ہے قریب آجاؤ	۱۸۳
۷۰۔ رباعی	۱۸۵

۷۱۔	جانشین	۱۸۶
۷۲۔	راتیں ہیں اُداس دن کڑے ہیں	۱۹۱
۷۳۔	سیلاب	۱۹۳
۷۴۔	لے اڑا پھر کوئی خیال ہمیں	۱۹۶
۷۵۔	ہم ہیں ظلمت میں کہ اُبھرا نہیں خورشید ابھی	۱۹۸
۷۶۔	۲۳ مارچ	۲۰۰
۷۷۔	دل کو اب یوں تری ہر ایک ادا لگتی ہے	۲۰۴
۷۸۔	ہم اپنے آپ میں گم تھے ہمیں خبر کیا تھی	۲۰۶
۷۹۔	تفاوت	۲۰۸
۸۰۔	اب تک تیرے فتنے ہیں سلامت اُسے کہنا	۲۱۰
۸۱۔	تسلسل	۲۱۲
۸۲۔	چاندنی رات کو سحر کہنا	۲۱۵
۸۳۔	ہلالِ عید	۲۱۷
۸۴۔	جانے کس غم سے من سُلگتا ہے	۲۲۱
۸۵۔	واہمہ	۲۲۳
۸۶۔	یہ میں، یہ کوئے دار، یہ تنہائی دوستو!	۲۲۶
۸۷۔	کینسر	۲۲۸
۸۸۔	آتشِ عجم	۲۳۰

بہ زیرِ شاخِ گل اُفعی گزیدہ بُلبل را
نواگران نہ خوردہ گزند را چہ خبر

(نظیری)

جب رُوح کسی بوجھ سے تھک جاتی ہے
احساس کی لَو اور بھڑک جاتی ہے
مَیں بڑھتا ہُوں زندگی کی جانب لیکن
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے

شاعر

جس آگ سے جی آج جل اُٹھا ہے اچانک
پہلے بھی مرے سینے میں بیدار ہُوئی تھی
جس کرب کی شدت سے مری رُوح ہے بے کل
پہلے بھی مرے ذہن کا آزار ہُوئی تھی
جس سوزش سے میں آج لہو تھوک رہا ہُوں
پہلے بھی مرے حق میں یہ تلوار ہُوئی تھی

وُہ غم — غمِ دُنیا جسے کہتا ہے زمانہ
وُہ غم مجھے جس غم سے سروکار نہیں تھا
وُہ درد کہ ہر دَور کے اِنسان نے جھیلا
وُہ درد مرے عشق کا معیار نہیں تھا
وُہ زخم کہ ہر سینے کا ناسُور بنا ہے
وُہ زخم مجھے باعثِ آزار نہیں تھا

دُنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا
لیکن مرا احساس غمِ ذات میں گم تھا
آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں
لیکن مرا دل اپنے ہی حالات میں گم تھا
مَیں وقت سے بیگانہ زمانے سے بہت دُور
جام و مَے و مینا و خرابات میں گم تھا

دربار کی تفریح کا ساماں تھا مرا فن
ہاتھوں میں مرے ظرفِ گدا لب پہ غزل تھی
شاہوں کی ہوا خواہی مرا ذوقِ سخن تھا
ایوانوں کی توصیف و ثنا اوجِ عمل تھی
اور اس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے
ورنہ مرا انعام فقط تیغِ اجل تھی

چھیڑے کبھی میں نے لب و رخسار کے قصے
گاہے گل و بلبل کی حکایت کو نکھارا
گاہے کسی شہزادے کے افسانے سنائے
گاہے کیا دنیائے پرستاں کا نظارا
میں کھویا رہا جنّ و ملائک کے جہاں میں
ہر لحظہ اگرچہ مجھے آدم نے پکارا

برسوں یُونہی دلجمعیِ اورنگ کی خاطر
سَو پھول کھلائے کبھی سَو زخم خریدے
مَیں لکھتا رہا ہجو بغاوت منشوں کی
مَیں پڑھتا رہا قصر نشینوں کے قصیدے
اُبھرا ابھی اگر دِل میں کوئی جذبۂ سرکش
اس خوف سے چُپ تھا کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے

لیکن یہ طلسمات بھی تا دیر نہ رہ پائے
آخر مَے و مینا و دَف و چنگ بھی ٹُوٹے
یُوں دست و گریباں ہُوئے انسان و خداوند
نخچیر تو تڑپے قفسِ رنگ بھی ٹُوٹے
اس کشمکشِ ذرّہ و انجم کی فضا میں
کشکول تو کیا افسر و اورنگ بھی ٹُوٹے

میں دیکھ رہا تھا کہ مرے یاروں نے بڑھ کر
قاتل کو پکارا کبھی مقتل میں صدا دی
گاہے رسن و دار کے آغوش میں جھولے
گاہے حرم و دیر کی بنیاد ہلا دی
جس آگ سے بھرپور تھا ماحول کا سینہ
وہ آگ مرے لوح و قلم کو بھی پلا دی

اور آج شکستہ ہُوا ہر طوقِ طلائی
اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے
اب میرا ہُنر ہے مرے جمہور کی دولت
اب میرا جنوں خائفِ تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

رباعی

لفظوں کے فسانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
لمحوں میں زمانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
تو زہر ہی دے شراب کہہ کر ساقی
جینے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ

○

تیری باتیں ہی سُنانے آئے
دوست بھی دِل ہی دکھانے آئے

پھُول کھِلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

ایسی کچھ چُپ سی لگی ہے جیسے
ہم تجھے حال سُنانے آئے

عشق تنہا ہے سرِ منزلِ غم
کون یہ بوجھ اُٹھانے آئے

اجنبی دوست ہمیں دیکھ کہ ہم
کچھ تجھے یاد دلانے آئے

دِل دھڑکتا ہے سفر کے ہنگام
کاش پھر کوئی بُلانے آئے

اَب تو رونے سے بھی دِل دُکھتا ہے
شاید اَب ہوش ٹھکانے آئے

کیا کہیں پھر کوئی بستی اُجڑی
لوگ کیوں جشن منانے آئے

سو رہو موت کے پہلو میں فرازؔ
نیند کس وقت نہ جانے آئے

○

جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

جل رہے ہیں ہرے بھرے گلزار
غم ہُوا ہے کہاں کہاں آباد

کہہ رہی ہے شکستگی دل کی
تھا مکینوں سے یہ مکاں آباد

ہم نے دیکھی ہے گوشۂ دل میں
ایک دُنیائے بے کراں آباد

چند منظر اُجاڑنے والو
ہو رہے ہیں کئی جہاں آباد

گھر جلا کر نہ رو محبّت میں
یہ تو ہوتا ہے خانماں آباد

کتنے تارے فرازؔ ٹُوٹ چکے
ہے ابھی تک یہ خاکداں آباد

کھنڈر

عبث کیوں اُلٹتے پلٹتے ہو جھوٹی روایات کی عظمتوں کے کھنڈر
یہاں کچھ نہیں ہے
یہاں تم نہ پاؤ گے کوئی خزانہ
نہ شدّاد کی جنّتِ گمشدہ کا کوئی لعل و دُر سے جڑا آستانہ
نہ فرعون کا کوئی خفیہ خزینہ
نہ قارون کا کوئی دفینہ
نہ جمشید کے جام و مینا
نہ نمرود کے باغِ آغوش کی چہچہاتی ہوئی کوئی الھڑ حسینہ

یہاں کچھ نہ ڈھونڈو
یہاں کچھ نہیں ہے

یہاں خشک و ویران خطوں میں
مدت سے خانہ برانداز عفریت چاروں طرف خیمہ زن ہیں
یہاں سالہا سال سے قرن ہا قرن سے
وحشت انگیز اوہام سایہ فگن ہیں
یہاں بے شمار اُلوؤں کے بسیرے ہیں چمگادڑوں کے ٹھکانے ہیں اور
گیدڑوں نے کئی غار کھودے ہوئے ہیں
جو دن کے دھندلکوں میں شب کی سیاہی میں آسیب صورت
کبھی ایک ایک اور کبھی سب کے سب مل کے یوں چیختے ہیں
کہ جیسے بنی نوعِ انساں کی تخریب پہ نوحہ گر ہوں

یہاں کوئی تپتی ہوئی دوپہر ہو کہ سرما کی تاریک و مفلوج شب ہو

کبھی کوئی ابرِ خراماں نہ برسا نہ چھایا

یہاں کوئی شعلہ نہ بھڑکا نہ کوئی چراغِ سحر ٹمٹمایا

کہ جیسے ہمیشہ پُرافشاں رہا ہو یہاں اجنبیّت کا گھمبیر سایہ

کہ اس سرزمیں کی فضائیں خلائیں کبھی بھی کوئی بھی تغیّر نہ آیا

مگر یہ کھنڈر

روزِ اوّل سے ہی

پتھّروں اور اینٹوں کے انبار ہائے پریشاں نہیں تھے

فقط ادھ کٹے بُت شکستہ ستوں ٹُوٹے پھُوٹے ظرُوف

اور جھکے بام و در یُونہی سر در گریباں نہیں تھے

یہاں صرف ویرانیوں کے مناظر ہی تاریخِ ماضی کے عنواں نہیں تھے

یہ وُہ سرزمیں ہے

کہ جس پر زمرّد کے یاقوت کے تخت جلوہ فگن تھے

یہاں سنگِ سرخ اور مرمر کے بے مثل و نادر محلّات

گلکاریوں سے مرصّع تھے معراجِ فن تھے

یہاں بے بہا اور نایاب قالین فرشِ رہِ کاخِ فرمانروائے زمن تھے

یہاں ریشم و اطلس و پرنیاں اور دیبا و زربفت و سنجاب و کمخواب

کے بے نظیر اور عریاں ذخیرے شکن در شکن تھے

یہاں لہلہاتے ہوئے گلستاں رشکِ باغِ عدن تھے

یہاں سونے چاندی کے ڈھیروں میں لعل و جواہر میں

تلتی کنیزوں کے گل رنگ چہرے فضا تاب سینے سنہرے بدن تھے

اور ان کی حفاظت کو چوبی صلیبیں تھیں زندانِ آہن تھے دار و رسن تھے

یہاں کاس و قیتار کی گرم تانوں سے جام و سبو کے فسانوں سے

عیش و نشاط و مسرّت کے جشنِ چراغاں منائے گئے ہیں

یہاں خوش گلو اپسراؤں کے ہر تارِ گیسو سے تزئین بر لبط روا تھی

یہاں زندگی صرف زخمِ نوا تھی !!

یہاں باادب باسلیقہ غلاموں نے سجدے کئے اور ثبوتِ وفا کیلئے

گردنیں تک کٹادیں

مگر رحم دِل اور کشادہ دل آقاؤں کی عدل و انصاف سے

جگمگاتی جبینوں پہ کوئی شکن تک نہ آئی

بہ ایں حال بھی مطمئن تھی خدائی

مگر وقت کی پے بہ پے کروٹوں نے کئی گل کھلائے

کبھی تو ہلاکو و چنگیز و تیمور نے بربریت کے پرچم اُٹھائے

کبھی تو رماں اور نادر کی جرّار فوجوں نے یلغار کی، شہر لوٹے جلائے

تباہی کے دف صورِ محشر کی صورت ہر اک سمت بھونچال لائے

بگولوں کے دامن میں امن وسکوں کے درخشندہ فانوس جلنے نہ پائے

اور اپنی روایات کے تلخ و تیرہ دھوئیں چھوڑ کر بجھ گئے مٹ گئے ہیں

یہ کہنہ روایات جن کی گھنی ظلمتوں میں نہ جادہ نہ منزل

غبارِ رواں کی طرح چھا رہی ہیں

دلوں کو دماغوں کو نظروں کو بھٹکا رہی ہیں

اور ان کے جلو میں نہ لیلا نہ محمل
نہ جذبِ تجسّس کا حاصل
یہاں کچھ نہیں کچھ نہیں ہے
فقط کچھ کھنڈر ابنِ آدم کی تاریخ پر منفعل ہیں

○

کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں
جو دشت والے تھے وہ بھی اُٹھ آئے شہروں میں

ہماری سادہ دلی دیکھیے کہ ڈھونڈتے ہیں
ہم اپنے دیس کی باتیں پرائے شہروں میں

کچھ اُس طرح سے ہر اک بام و در کو دیکھتے ہیں
زمانے بعد کوئی جیسے آئے شہروں میں

سُنا ہے جب بھی لُٹی ہے بہارِ ویرانہ
تو چند اور چمن مُسکرائے شہروں میں

قدم قدم پہ ہُوئے تلخ تجربے پھر بھی
ہمیں حیات کے غم کھینچ لائے شہروں میں

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

فرازؔ ہم وُہ غزالانِ دشت و صحرا ہیں
اسیر کر کے جنھیں لوگ لائے شہروں میں

بھول

اُفق پر دھند لکے، شفق میں اَلاؤ، گھٹاؤں میں شعلے، چمن میں ببُول
بہاروں میں صَرصَر کے گھمبیر سائے
نظاروں کے دامن میں نکبت بسائے
دلوں پر اُداسی دماغوں میں اُلجھن خیالوں میں تلخی نگاہیں ملوُل
ہر اک سِمت وِیرانیوں کا نزُول
جلاتا رہا مَیں اندھیروں میں شمعیں، کھلاتا رہا خارزاروں میں پھوُل
شعاعوں سے تاریکیوں کو اُجالے
خرابوں پہ تعمیر کا عکس ڈالے

بڑے زخم کھا کر مگر مسکرا کر کیے زندگی نے حوادث قبول
اُڑاتی پھری دشت و صحرا کی دھول

وہی وقت کی سست رفتار گردش وہی موت کی رہگزاروں کا طول
وہی چار سو دہکے الاؤ
وہی گلستاں میں خزاں کا رچاؤ
وہی چاند تاروں پہ کہنہ دھندلکے وہی ظلمتوں کا پرانا اصول
مگر کون سمجھے یہ کس کی تھی بھول؟

رباعی

اک راہِ طویل اک کڑی ہے یارو
اُفتاد عجیب آ پڑی ہے یارو
کِس سمت چلیں کدھر نہ جائیں آخر
دوراہے پہ زندگی کھڑی ہے یارو

غنچے کی چٹک سُنائی دے گی یارو
ساغر کی کھنک سُنائی دے گی یارو
زنداں کا سکوت گونج اُٹھے جس سے
ایسی دستک سُنائی دے گی یارو

فرار

کئی ایاغ دل میں آنسوؤں کے بیج بو گئے
شرابِ لالہ گوں کے عکس عکس میں
جہانِ رنگ و بُو لئے
فریبِ آرزو دیئے
گھنیری آندھیوں کے رقص رقص میں
کئی چراغ ظلمتوں کی وادیوں میں کھو گئے

پچھے رہے سراب گام گام پر
جمالِ ضو فشاں لئے
مآلِ خونچکاں لئے
حیات کے ہر اک نئے مقام پر
ہزاروں داغ مسکرا دیئے چراغ ہو گئے

مگر چلے ہو کس کی جستجو میں تم
وفا کی روشنی لئے
ہر ایک چاک دل سیئے
تصوّرِ حصولِ آرزو میں تم
کئی دماغ موت کی کمیں گہوں میں سو گئے

○

دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمنِ جانِ بہار
زخم دکھلائیں کسے پھر سینہ چاکانِ بہار

نشۂ احساسِ خوش وقتی نے اندھا کر دیا
برق بھی چمکی تو ہم سمجھے چراغانِ بہار

خوں رلواتے ہیں سب کو اپنے اپنے تجربے
وہ پشیمانِ خزاں ہوں یا پشیمانِ بہار

اب کے کچھ ایسی ہی بن آئی کہ ہم معذور ہیں
ورنہ کب پھیرا تھا ہم نے کوئی فرمانِ بہار

اے خوشا عہدِ خزاں جب نغمہ پیرائی تو تھی
اب تو سرمہ در گلو ہیں خوشنوایانِ بہار

گر یونہی بادِ صبا اٹھکیلیاں کرتی پھری
شعلۂ گل سے بھڑک اُٹھے گا دامانِ بہار

کب ہوئے دل تنگ ہم زنداں میں بھی رہ کر فراز
ہاں مگر جب آ گئی ہے یادِ یارانِ بہار

احتساب

سوچ مفلوج ہے حالات کے زندانوں میں
عقل پر تلخ حوادث کے گراں تالے ہیں
آگہی سرد و خموش
منجمد شعلۂ ہوش
ذہن پر بھولے فسانوں کے گھنے جالے ہیں
کوئی آہٹ بھی نہیں دل کے سیہ خانوں میں
قہقہے وقت کے خوش رنگ شبستانوں میں
کتنی دلدوز و غمیں آہوں کے رکھوالے ہیں

آرزو جام طرب
آبرو زہر بلب

کتنے ہی ناگ خزانوں نے یہاں پالے ہیں
کتنے پیکر ہیں جو ڈھل جاتے ہیں ایوانوں میں
زندگی رنگینی ہے موت کے ویرانوں میں
انقلابات نے انداز بدل ڈالے ہیں

رات دن شام و سحر
کس کو جرأت ہو مگر

ناگ خود ہی تو خزانوں نے یہاں پالے ہیں
آگ پھولوں نے بکھیری ہے گلستانوں میں

○

ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوالی ہے
کہ شہرِ حسن میں جلووں کی قحط سالی ہے

کہاں ہے دوست کہ آشوبِ ہر سے میں نے
ترے خیال کی آسودگی بچا لی ہے

بتا رہا ہے فضا کا اٹوٹ سنّاٹا
افق سے پھر کوئی آندھی اترنے والی ہے

لرز رہے ہیں شگوفے چمن میں کھلتے ہوئے
حنائے دستِ صبا میں لہو کی لالی ہے

پیئو شراب کہ ناصح نے زہر بھی دے کر
ہماری جرأتِ رندانہ آزمالی ہے

پھر آج دانۂ گندم کے سلسلے میں فراز
کسی خدا نے میری خلد بیچ ڈالی ہے

○

ہر شاخِ چمن کی جل رہی ہے
کیا بادِ مراد چل رہی ہے

ہم ہیں کہ فریب کھا رہے ہیں
دُنیا ہے کہ چال چل رہی ہے

یُوں دِل میں ہے تیری یاد جیسے
ویرانے میں آگ جل رہی ہے

رُخ پھیر لیا ہے جب سے تُو نے
دُنیا کی نظر بدل رہی ہے

دَر پیش ہے آج بھی وہ صورت
جو صُورتِ حال کل رہی ہے

اتنی بھی فراز بد دِلی کیا
سنبھلو! کہ فضا بدل رہی ہے

آگ

مفلسو! اپنے مقدر سے شکایت نہ کرو
اس سے انسان کے ایمان میں فرق آتا ہے
ہم تو ناچیز سے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
کتنے گمراہ و گنہگار ہوئے جاتے ہو

کیا کہا؟ "خانماں برباد ہوئے جاتے ہیں
دمبدم آگ کے بے رحم لپکتے شعلے
اپنے بوسیدہ مکاں راکھ کئے دیتے ہیں
خاک ہی خاک ہوئی جاتی ہے دُنیا اپنی
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی
مرمر و آہن و سیماں کی عماراتِ بلند
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں
کیا خُدا صرف غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے"

ٹھیک کہتے ہو مگر خام عقائد والو
ہم تو تقدیر کے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
اور پھر اپنی شکایت سے بھی کیا ہوتا ہے
وُہی ہوتا ہے جو منظورِ خُدا ہوتا ہے

رباعی

پھُولوں کی جبیں جھُلس گئی ہے یارو
گلزار میں آگ بس گئی ہے یارو
گزرے ہیں کہاں سے رنگ و بو کے طوفاں
شبنم کو فضا ترس گئی ہے یارو

اُڑتے پنچھی شکار کرنے والو
گلزار میں گیر و دار کرنے والو
کتنی کلیاں مسل کے رکھ دیں تم نے
تزئینِ گل و بہار کرنے والو

بانوؔ کے نام

ملوکیت کے محل کی گناہگار کنیز
وُہ جرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی
وُہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف
تیری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی
وُہ کونسا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب
ہر ایک جبر کو تو سہہ گئی بطیبِ دلی

ؔ : وہ کمسن کنیز جسے بیگم جوناگڑھ نے قتل کروادیا

یہی سنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
کہ تو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تیری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے
جو خواجگی کو زر و سیم میں چھپانے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش
مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اونچے محلات کے بھرم کے لئے
ہر ایک دَور میں تزئینِ طوق و دار ہوئی
کبھی چُنی گئی دیوار میں انار کلی
کبھی شکنتلا پتھراؤ کا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر
مؤرّخین کی نظروں میں بیگناہ رہے
بغیضِ وقت اگر کوئی راز کھُل بھی گیا
زمانے والے طرفدارِ کج کلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

مجسّمہ

اے سیہ فام حسینہ ترا عریاں پیکر
کتنی پتھرائی ہُوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے
جانے کس دورِ المناک سے لے کر اب تک
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے

تیرے شب رنگ ہیولے کے یہ بے جان نقوش
جیسے مربُوط خیالات کے تانے بانے
یہ تری سانولی رنگت، یہ پریشان خطوُط
بارہا جیسے مٹایا ہو انہیں دُنیا نے

ریشۂ سنگ سے کھینچی ہُوئی زلفیں جیسے
راستے سینۂ کہسار پہ بل کھاتے ہیں
ابروؤں کی جھکی محرابوں میں جامد پلکیں
جس طرح تیر کمانوں میں اُلجھ جاتے ہیں

منجمد ہونٹوں پہ سنّاٹوں کا سنگین طلسم
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں
تند جذبات سے بھرپور برہنہ سینہ
جیسے سستانے کو طوُفان ذرا ٹھہرے ہوں

جیسے یُونان کے مغرُور خداوندوں نے
ریگزارانِ حبش کی کسی شہزادی کو
تشنہ رُوحوں کے ہوسناک تعیّش کے لئے
حجلۂ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

نشۂ گیسوئے شب تاب کہاں
آنکھ کھُل جائے تو پھر خواب کہاں

جی جلاتے ہیں سحر کے جھونکے
کھو گیا چشمۂ مہتاب کہاں

شہر سنسان ہے صحرا کی طرح
اب وُہ ہنگامۂ احباب کہاں

سطحِ دریا تو ہے ہموار مگر
بستیاں ہوگئیں غرقاب کہاں

تلخیٔ سم ہے لبوں کے مس تک
کوئی پی جائے تو زہراب کہاں

عشق اک کوہِ گراں تھا پہلے
اب محبّت کے وُہ آداب کہاں

اب کہاں اہلِ وفا ملتے ہیں
پہلے ہم لوگ تھے نایاب کہاں

اب تو دھڑکن سے بھی جی رُکتا ہے
اب یہ دل پارۂ سیماب کہاں

ق

ہم بھی کرتے تھے چراغانِ بہار
لیکن اَب آنکھوں میں خوناب کہاں

ہم کو بھی لذّتِ غم تھی پیاری
لیکن اَب جی میں تب و تاب کہاں

اَب بھی پایاب نہیں موجۂ غم
پھر بھی اندیشۂ سیلاب کہاں

○

کیا رُخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خُود ہی ہُوئے تباہ ورنہ
دُنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں اُن دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دُنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فراز آندھیاں تھیں
دِل تھا کہ فراز پنکھڑی تھی

مسیحا

میری افسردگی سے پریشاں نہ ہو
تُو مری تلخیوں کا سبب تو نہیں
تیری آنکھیں تو میری ہی دمساز ہیں
تھیں کبھی اجنبی لیکن اب تو نہیں
تجھ کو میری مسرّت مقدّم سہی
تیرا غم مجھ کو وجہِ طرب تو نہیں

تیرا احسان ہے تُو نے میرے لئے
اپنی پلکوں سے راہوں کے کانٹے چُنے

خود کڑی دُھوپ میں رہ کے میرے لئے
تُو نے زُلفوں کے شاداب سائے بُنے
میری خاطر زمانے کو پاگل کہا
میری خاطر زمانے کے طعنے سُنے

تو مری زندگی ہے مگر جانِ من!
اب وُہ عشق و محبّت کی رسمیں نہیں
میرے دل میں کئی گھاؤ ایسے بھی ہیں
جن کا درماں تری دسترس میں نہیں
ایک غم جس کی شدّت ہمہ گیر ہے
تیرے بس میں نہیں میرے بس میں نہیں

تشنگی

دیکھو پگھلا پگھلا سونا بہہ نکلا کہساروں سے
دیکھو نازک کرنیں ٹوٹ رہی ہیں ٹیلوں پر
دیکھو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے گلزاروں سے
دیکھو نیلے نیلے بادل جھول رہے ہیں جھیلوں پر

تم بھی سندر سندر سپنوں کی لہروں پر بہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

سلگا سلگا موسم ہے شعلوں کی دہکتی حدت سے
چڑھتے سورج کے سائے میں ساری دُنیا جلتی ہے
دہک دہک اُٹھی ہیں سڑکیں تپتی دھوپ کی شدت سے
ابھی نہ جاؤ دیکھو کتنی تیزی سے لُو چلتی ہے

اس کو بھی اک جبرِ مشیت سمجھو اور سہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

دیکھو چار طرف ٹھنڈے سائے لہراتے ہیں

تارے بکھرے موتی بکھرے شام کا جادو قائم ہے

خنک خنک پھولوں کے جھونکے خوشبوئیں برساتے ہیں

ٹھیک ہے تم کو جانا ہے پر ایسا بھی کیا لازم ہے

ٹھہرو کچھ باتیں ہم سے سُن لو کچھ تم کہہ جاؤ

اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

○

گوارا بھی سہی جو دُکھ ترے ہیں
مگر ہم کو کئی غم دُوسرے ہیں

عجب اہلِ چمن کے دن پھرے ہیں
بہاروں کے بگولوں میں گھرے ہیں

وطن میں وضعداری نے نہ چھوڑا
پرائے شہر ہم دَر دَر پھرے ہیں

سمائے پھر نہ دُنیا کی نظر میں
نہ جانے کس بلندی سے گرے ہیں

غنیمت ہے جو ہنس کر بات کر لیں
ہمیں مت چھیڑیئے ہم سر پھرے ہیں

جو دُنیا کے ہُوئے وہ سخت رُوئے
خوشا وُہ لوگ جو اَب تک ترے ہیں

ابھی سے کیا حدیثِ قعرِ دریا
ابھی تو موجِ ساحل میں گھرے ہیں

فرازؔ آج اتفاقاً مل گئے تھے
یہ صاحب بھی تو دیوانے نرے ہیں

○

کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

یادش بخیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں
اِک دَور تھا عجب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

بے مہریٔ حیات کی شدّت کے باوجود
دل مطمئن تھا جب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

میں اور تقابلِ غمِ دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

اک خواب ہو گئی ہے رہِ و رسمِ دوستی
اک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

وہ بزمِ دوست یاد تو ہوگی تمہیں فرازؔ
وہ محفلِ طرب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

○

اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
ترے فراق کے دُکھ یاد آنے لگتے ہیں

ہمیں ستم کا گلہ کیا، کہ یہ جہاں والے
کبھی کبھی ترا دل بھی دکھانے لگتے ہیں

سفینے چھوڑ کے ساحل پہ چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

پلک جھپکتے ہی دُنیا اُجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

فراؔز ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

رباعی

یہ دَورِ مے و جام چلے یا نہ چلے
نشے سے بھی پھر کام چلے یا نہ چلے
ہم اہلِ خرابات سے یوں بیَر نہ رکھ
ساقی ترا کل نام چلے یا نہ چلے

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ یورشِ حالات ٹلے یا نہ ٹلے
روشن کر چراغِ دیر و کعبہ
پھر شمعِ خرابات جلے یا نہ جلے

○

رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے
آپ آئے بھی مگر رونے کے عادی روئے

اُن کے آ جانے سے کچھ تھم سے گئے تھے آنسو
اُن کے جاتے ہی مگر رونے کے عادی روئے

ہائے پابندیٔ آداب تری محفل کی
کہ سرِ راہگزر رونے کے عادی روئے

ایک تقریبِ تبسّم بھی بہاراں لیکن
پھر بھی آنکھیں ہوئیں تر رونے کے عادی روئے

دردمندوں کو کہیں بھی تو قرار آ نہ سکا
کوئی صحرا ہو کہ گھر رونے کے عادی روئے

اے فراز ایسے میں برسات کٹے گی کیونکر
گر یونہی شام و سحر رونے کے عادی روئے

ان کے وعدوں پہ یقیں، لوگ بھی دیوانے ہیں
اِک فقط میں ہی نہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

میری وحشت ہی سہی موردِ الزام مگر
اے مری زہرہ جبیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

گردشِ جام کہاں، گردشِ ایام کہاں
یہ خرابات نشیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

آپ تو حاصلِ ایمان دو عالم ہیں حضور
آپ اور دشمنِ دیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

اک ملاقات سرِ رہ بھی سہی جرم مگر
ہم کہیں آپ کہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

دردمندانِ محبّت تو ہیں بدنام فرازؔ
ورنہ کچھ کچھ یہ حسیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

ایبٹ آباد

ابھی تلک ہے نظر میں وہ شہر سبزہ و گل
جہاں گھٹائیں سر رہگزار جھومتی ہیں
جہاں ستارے اترتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جہاں پہاڑوں کی قوسیں فلک کو چومتی ہیں
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبوئیں
چنار و سرو کی پرچھائیوں میں گھومتی ہیں

ابھی تلک ہیں نظر کے نگار خانے میں
وہ برگِ گُل سے تراشے ہوئے بہشت سے جسم
وُہ بولتے ہوئے افسانے الف لیلیٰ کے
وہ رنگ و نور کے پیکر وہ زندگی کے طلسم
اور ایسی کتنی ہی رعنائیاں ہیں جن کے لئے
خیال و فکر کی دُنیا میں کوئی نام نہ اِسم

ابھی تلک ہیں تصوّر میں وہ در و دیوار
بسیط دامنِ کہسار میں چناروں تلے
جہاں کسی کی جواں زلف بارہا بکھری
جہاں دھڑکتے ہوئے دل محبتوں میں ڈھلے
عجیب تھی وہ جھروکوں کی نیم تاریکی
جہاں نظر سے نظر جب ملی چراغ جلے

مَیں لوٹ آیا ہوں اس شہرِ سبز و گل سے
مگر حیات انھیں ساعتوں پہ مرتی ہے
مجھے یقیں ہے گھنے بادلوں کے سائے میں
وُہ زلف اب بھی مری یاد میں بکھرتی ہے
چراغ بجھ بھی چکے ہیں مگر پسِ چلمن
وُہ آنکھ اب بھی مرا انتظار کرتی ہے

○

تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لئے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے، جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اُٹھیں کہ سُورج بجھ گئے
ہائے وُہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

مدتیں گزریں اسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ ناواقف، فضا بیگانہ، ہم ناآشنا

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خلق شبنم کے لئے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم لیکن فرازؔ
دوست دشمن کا نکل آیا ہے اپنا آشنا

○

ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اَب وہاں خاک اُڑاتی ہے خزاں
پھُول ہی پھُول جہاں تھے پہلے

اَب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موج رواں تھے پہلے

پوچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزمِ مغاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پس رو
منزل ہم سفراں تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبّت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تجھ سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسّر تھی فرازؔ
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

طلسمِ ہوشربا

ابھی اک پھُول کے دامن سے کوئی بھنورا اُڑا
اور اُڑتے ہی اُجالے میں کہیں ڈوب گیا
ابھی اک شاخ کے سائے سے سرکتا ہُوا سانپ
پاس بہتے ہوئے نالے میں کہیں ڈوب گیا

گنگناتے ہُوئے نالے کا سنہرا پانی
دیکھتے دیکھتے اک جھیل بنا نہر بنا
یُوں اُبھر آئے کناروں پہ دمکتے ایواں
ایک اُجڑے ہُوئے خطے میں نیا شہر بنا

یہ فصیلوں میں گھرا راج محل کس کا ہے
یہ پراسرار در و بام انوکھے فانوس
بربط و چنگ و خم و جام لئے دست بدست
منتظر کس کا ہے یہ زہرہ جبینوں کا جلوس

میں شہنشاہِ زمن ہُوں کسے معلوم نہیں
ہر طرف موجبِ تعمیل ہیں فرمان مرے
میرے ادنیٰ سے اشارے پہ ہیں سب رقص کناں
یہ سپاہی، یہ حسینائیں، یہ دربان مرے

کوئی ہے! کون؟ زرینہ نظر افروز کنیز
جیسے مینائے مے ناب دھری ہو کوئی
یہ پریشان سی زلفیں یہ برہنہ سینہ
جس طرح قاف کی آوارہ پری ہو کوئی

خادمہ! آج سے اس قصر کی تُو ملکہ ہے
آ مجھے اپنی گرہ گیر لٹوں میں کس لے
آ مرے جسم سے اک سانپ کی مانند لپٹ
اور تڑپ کر مرے بیتاب لبوں کو ڈس لے

○

سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اٹھائیں بھی
وہ یاد آئے تو چلنے لگیں ہوائیں بھی

یہ شہر میرے لئے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

جو بزمِ دوست سے اُٹھ کر چلے بزعم تمام
کوئی پکارے تو شاید وہ لوٹ آئیں بھی

دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے گھٹتا ہے
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی

ہم ایسے لوگ جو آشوبِ دہر میں بھی ہیں خوش
عجب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی

سحر گزیدہ ستاروں کا نور بجھنے لگا
فرازؔ اُٹھو اب اس کی گلی سے جائیں بھی

○

وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے
دِل جن سے مآلِ کار ٹوٹے

ہو ختم کشاکشِ زمانہ
یا دامِ خیالِ یار ٹوٹے

پھر تجھ پہ یقین کر رہے ہیں
وہ دِل جو ہزار بار ٹوٹے

کھائیں گے فریب ہم خوشی سے
پر، یوں کہ نہ اعتبار ٹوٹے

وہ پچھلا پہر شبِ الم کا
آنسو بھی ستارہ وار ٹوٹے

کیا چھوڑتے یاد دوستوں کی
وہ تیر، جو دل کے پار ٹوٹے

کانپ اُٹھے فرازؔ دونوں عالم
جب سازِ وفا کے تار ٹوٹے

○

انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چپ ہیں
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چپ ہیں

آسان نہ کر دی ہو کہیں موت نے مشکل
روتے ہوئے بیمار بڑی دیر سے چپ ہیں

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چپ ہیں

ساقی یہ خموشی بھی تو کچھ غور طلب ہے
ساقی ترے میخوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

یہ برق نشیمن پہ گری تھی کہ قفس پر
مرغانِ گرفتار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اس شہر میں ہر جنس بنی یوسفِ کنعاں
بازار کے بازار بڑی دیر سے چُپ ہیں

پھر نعرۂ مستانہ فرازؔ آؤ لگائیں
اہلِ رسن و دار بڑی دیر سے چُپ ہیں

خریدار

دلِ بیتاب کی موہوم سی تسکیں کے لیے
اک نظر دیکھنے آیا تھا تجھے دیکھ لیا
آج کی رات بھی تو اپنے دریچے کے قریب
حسبِ معمول نئی شان سے استادہ ہے
تیرتے ہیں تری آنکھوں میں اشارے کیا کیا
دیدنی ہے ترے جلووں کی نمائش لیکن
اب یہ عالم ہے کہ احساسِ تہی دستی سے
تیرے زینے کی طرف تیرے دریچے کی طرف
پاؤں تو کیا مری نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتیں

رباعی

خوابوں میں خیال کھو رہے ہوں جیسے
نشّے میں زمانے سو رہے ہوں جیسے
سینے سے ڈھلک گیا ہے کس کا آنچل
خورشید طلوع ہو رہے ہوں جیسے

ساغر میں ستارے گھُل رہے ہوں جیسے
کرنوں کے دریچے کھُل رہے ہوں جیسے
مستی میں اُٹھتی ہوئی نظریں توبہ
پلکوں پہ زمانے تُل رہے ہوں جیسے

خیر مقدم

قصیدہ نویسوں نے مل کر یہ سوچا
کہ پھر آج وہ ساعتِ جانستاں آگئی ہے
جب ان سے کوئی ان کا آقا جُدا ہو رہا ہے
وہ آقا؟
کہ جس کی مسلسل کرم گستری سے
کوئی خادمِ خاص ہو یا کہ ادنیٰ ملازم
کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا
وہ آقا کہ جس کی کشادہ دلی نے خزانے لٹائے

وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں
سے حاتم کے مفروضہ قصّے بھلائے

اگرچہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کو بکو
بھیس بدلے نہیں گھومتا تھا

مگر پھر بھی ہر سمت امن و اماں تھا

اگرچہ جہانگیر کی طرح اس نے
کوئی ایسی زنجیرِ زر قصرِ شاہی کے باہر نہ لٹکائی تھی
جس کی ہلکی سی جنبش بھی انصافِ شاہی میں طوفاں اُٹھاتی
مگر پھر بھی ہر گھر پہ عدل و مساوات کا سائباں تھا

اگرچہ کبھی وہ جھروکے میں بیٹھے
رعایا کو روئے مبارک کے درشن سے مجبورِ سجدہ نہ کرتا
مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ حکمراں تھا

وہ جانِ جہاں تھا
بڑا مہرباں تھا

قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ آخر وہ لمحات بھی آ گئے ہیں
جب اُن سے بچھڑنے کو ہے ان کا دیرینہ آقا
تو وہ آج اسے کونسا ایسا نایاب تحفہ کریں پیش جس سے
رہیں تا ابد یاد آقائے عالی کو
اپنے وفادار و پاپوش بردار خادم

قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ یوں تو عہدے میں ہیں
قصرِ شاہی کے جاروب کش سے بھی کہتر
مگر عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں
وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشارے سے
ذرّوں کو ہم رتبۂ مہر و مہتاب کر دیں
وہ چاہیں تو اپنے تخیّل کے جادو سے
صحراؤں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں

فقیروں کو اورنگ و افسر کا مالک بنا دیں

وہ چاہیں تو اپنے فسونِ زباں سے
محلّات کے بام و دیوار ڈھا دیں
وہ چاہیں تو خسرو کا سر تیشۂ کوہکن سے کچل دیں
وہ چاہیں تو یکسر نظامِ زمانہ بدل دیں
کہ وہ عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں
یہی ہے وہ ساعت کہ وہ اپنے
محبوب آقا کی تعریف و توصیف میں
آسمان و زمیں کو ملائیں!

کہ وہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں
کہ وہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں
مگر پھر قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ تو ہیں عہدے میں ایوانِ شاہی

کے جاروب کش سے بھی کمتر

انہیں کیا کوئی آئے یا کوئی جائے

کہ ان کا فریضہ تو ہے صرف

آقائے حاضر کی خدمت گزاری

کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش

تو پھر مصلحت ہے اسی میں

کہ اپنے قصیدوں سے آقائے نو کا کریں خیر مقدم!

اے بھوکی مخلوق

(چودہ اگست ۱۹۵۴ء)

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ
چار طرف جگمگ جگمگ کرتی ہے شہر پنہ
پھر بھی تیری روح بجھی ہے اور تقدیر سیہ

پھر بھی ہیں پاؤں میں زنجیریں ہاتھوں میں کشکول
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول
آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق
اے بھوکی مخلوق

بیس نہ سو، نہ ہزار، نہ لاکھ ہیں، پورے آٹھ کروڑ
اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور
مزدور اور کسان کے حق پر جھپٹیں کالے چور

کھیت تو سونا اگلیں پھر بھی ہے ناپید اناج
تیرے دیس میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج
گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بوجھل ہیں صندوق
اے بھوکی مخلوق

آج گرفتہ دل تو کیوں ہے تو بھی جشن منا
آنسو گر نایاب ہیں اپنے لہو کے دیے جلا
پیٹ پہ پتھر باندھ کے امشب ننگا ناچ دکھا

آج تو ہنسی خوشی کا دن ہے آج یہ کیسا سوگ
تیری بہاریں دیکھنے آئیں دُور دُور کے لوگ
تیرے خزانے پل پل لوٹیں کتنے ہی فاروق
اے بھُوکی مخلوق

○

قافلے گزرے ہیں زنجیر بہ پا
دائم آباد رہے شہر ترا

دل ہے یا شہرِ خموشاں کوئی
نہ کوئی چاپ، نہ دھڑکن، نہ صدا

آخر عشق کی رسوائی ہے
اب ہُوا چرچا تو گھر گھر ہو گا

تجھ کو دیکھا ہے تو اب سوچتے ہیں
تجھ سے ملنے کا سبب کیا ہوگا

وہم تھا قافلۂ ہمسفراں
مڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

شبِ تیرہ ہی غنیمت تھی فرازؔ
چاند نکلا ہے تو دل ڈوب چلا

رباعی

ہر غم کو دلآویز کیے دیتا ہوں
احساس کی لو تیز کیے دیتا ہوں
تو زلف کو کچھ اور پریشاں کر دے
میں جام کو لبریز کیے دیتا ہوں

دل گرمیٔ احساس سے پھُک جائیں گے
قدموں میں ترے زمانے جھُک جائیں گے
اے حُسن فقط جنبشِ ابرُو کی ہے دیر
دُنیا کے کاروبار رُک جائیں گے

○

قاتل کے قصّے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں

دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

تنگ قبائے، کجکلہے، زرّیں کمرے
اس کافر میں ساری غزل کی باتیں ہیں

اپنی تہی دستی پر میں شرمندہ ہوں
تیرے لبوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

عقل کے اندھوں کی محفل میں چپ ہے فرازؔ
کتنی سیانی اس پاگل کی باتیں ہیں

چند نادان چند دیوانے

رات کی جانگداز ظلمت میں
عزم کی مشعلیں جلائے ہوئے
دل میں لے کر بغاوتوں کے شرار
وحشتوں کے مہیب سائے میں
سر بکف، جاں بلب، نگاہ بہ قصر
سرخ و خونیں علَم اٹھائے ہوئے
بڑھ رہے ہیں جنوں کے عالم میں
چند نادان چند دیوانے

قصرِ شاہی کے اے نگہبانو!
تلخ لمحوں سے ہوشیار رہو
اپنے پہروں پہ جم کے ڈٹ جاؤ
اپنے آقاؤں کی بقا کے لئے
فرض کے تند و تیز دھارے پر
تم وفادار ہو تو کٹ جاؤ

اس سے پہلے کہ مہرباں آقا
تند شعلوں کی زد میں آجائیں
اس سے پہلے کہ قصر جل اُٹھے
خاک پر لوٹتے نظر آئیں
چند نادان، چند دیوانے

کس قدر آگ برستی ہے یہاں
خلق شبنم کو ترستی ہے یہاں

صرف اندیشۂ افعی ہی نہیں
پھُول کی شاخ بھی ڈستی ہے یہاں

رُخ کدھر موڑ گیا ہے دریا
اَب نہ وُہ لوگ نہ بستی ہے یہاں

زندہ در گور ہوئے اہلِ نظر
کس قدر مُردہ پرستی ہے یہاں

زیست وہ جنسِ گراں ہے کہ فرازؔ
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں

ہر ہمسفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو
یارو پلٹ پلٹ کے ذرا دیکھتے رہو

کِس کِس کو اپنی اپنی رفاقت پہ زعم ہے
ہوتا ہے کون کون جدا دیکھتے رہو

ہر فصلِ گُل ہے غیر یقینی سی اِن دنوں
صرصر چلے کہ بادِ صبا دیکھتے رہو

سنتے رہو کہ وقت نے بدلی ہے راگنی
دم بھر میں انقلاب ہوا دیکھتے رہو

تھا کل تو ایک نعرۂ منصورؔ بھی گراں
اور اب کہ سینکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

یارو پلک جھپکتے ہی لٹتے ہیں قافلے
یاں خود کشی ہے لغزشِ پا دیکھتے رہو

احباب کوئے دار و رسن تک پہنچ گئے
اور تم فرازؔ دستِ صبا دیکھتے رہو

○

کٹھن ہے راہگزر تھوڑی دُور ساتھ چلو
بہُت کڑا ہے سفر تھوڑی دُور ساتھ چلو

تمام عُمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

نشے میں چُور ہُوں میں بھی، تمہیں بھی ہوش نہیں
بڑا مزہ ہو اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دُور ساتھ چلو

ابھی تو جاگ رہے ہیں چراغ راہوں کے
ابھی ہے دُور سحر تھوڑی دُور ساتھ چلو

طوافِ منزلِ جاناں ہمیں بھی کرنا ہے
فرازؔ تم بھی اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

لخنتی[۱]

اُدھ کٹے بالوں پہ افشاں کے تارے لرزاں
کھُردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں
سرد و بے جان سے چہرے پہ تھرکتی آنکھیں
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں

۱۔ سرحد کے وہ رقاص لڑکے جو بیاہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا رُوپ دھار کر ناچتے ہیں

ٹوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام امنگ
کسی سُوکھی ہُوئی ٹہنی کا جھکاؤ جیسے
لڑکھڑاتے ہُوئے قدموں کی گراں رفتاری
خشک ہوتی ہُوئی ندّی کا بہاؤ جیسے

رقص کرتی ہوئی پشواز پہ باہوں کی اُڑان
بادباں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں
یا کسی جھیل میں کنکر کے گرا دینے سے
چند لمحوں کے لئے دائرے بن جاتے ہیں

گرد آلوُد سے ماتھے پہ پسینے کی نمی
ریگزاروں سے عرق پھوٹ رہا ہو جیسے
جھنجھناتے ہُوئے ہر گام پہ پیلے گھنگرو
دُور اک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں، خاک بہ رُخ، نالہ بلب
منجمد، ساکن و حیران ہیولے کی طرح
چند تانبے کے تراشے ہوئے سکوں کے عوض
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

ایک منظر

دُور کچھ ماتمی نعروں سے فضا گونج اُٹھی
چند مجذوب سے لوگوں کا الم کوش گروہ
(کچھ سیہ پوش تماشائی بہ اندازِ جلوس)
چادرِ گل سے سجائے ہوئے اعلام لیے
دمبدم نیند میں ڈوبے ہوئے کوچوں کی طرف
چیختا پیٹتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

یک بیک کھلنے لگے بند دریچوں کے کواڑ
چلمنیں کانپتی بانہوں کے سہارے اٹھیں
جیسے دم توڑتے بیمار کی بوجھل پلکیں،
اور کئی مضطر و بے تاب دمکتے چہرے
ایک دلچسپ و المناک تماشے کے لئے
تنگ و تاریک جھروکوں کے گھنے پردوں سے
نور کے چشموں کی مانند اُبل آئے ہیں

رباعی

ظلمات کو موجِ نور کیسے سمجھیں
پھر برق کو برقِ طور کیسے سمجھیں
مانا کہ یہی مصلحت اندیشی ہے
ہم لوگ مگر حضور کیسے سمجھیں

آشوبِ گہہِ دہر کے سوداگر ہیں
مغرب کے کسی شہر کے سوداگر ہیں
تم آبِ حیات مانگتے ہو ان سے
جو لوگ فقط زہر کے سوداگر ہیں

اس ادا سے کبھی آ کر گزرو
دل کے صحرا کو بسا کر گزرو

سنگِ خارا ہے زمانے کی خاطر
دل کے آئینے بچا کر گزرو

روشنی رہبر رہزن بھی تو ہے
راہیو! شمعیں بجھا کر گزرو

کون جانے کہ یہ پتھّر ہیں کہ لوگ
دشتِ غربت میں صدا کر گزرو

کوئی کانٹا ہو کہ شبنم ہو کہ پھُول
سب کو آنکھوں سے لگا کر گزرو

سفرِ شوق ہو یا منزلِ غم
کوئی ہنگامہ اُٹھا کر گزرو

چڑھتے سُورج کے پجاری نہ بنو
اپنے سائے میں سما کر گزرو

وقت نے ساتھ دیا ہے کس کا
جی میں جو آئے سدا کر گزرو

پہلے دیوانوں کی رسمیں تھیں یہی
خون کانٹوں کو پلا کر گزرو

ایک پل ٹھہرو بگولوں کی طرح
اور پھر خاک اُڑا کر گزرو

یا تو موجوں کے شناسا نہ بنو
یا کناروں کو بہا کر گزرو

دل عجب شہر ہے ہنگاموں کا
کبھی اس سمت بھی آ کر گزرو

توسنِ وقت کی رفتار کے ساتھ
برق کے پنکھ لگا کر گزرو

فکر و ادراک کے درّوں میں فرازؔ
مشعلِ طبع جلا کر گزرو

○

دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو

لذّتِ غم بھی عجب نشّہ ہے
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

زندگی سلسلۂ خوابِ طرب
سایۂ زلف میں سو کر دیکھو

کتنی تسکین ہے احساس کی موت
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو

کتنا دِلکش ہے جہانِ گزراں
دل کے آئینے کو دھو کر دیکھو

ماہ و انجم بھی تھے آباد کبھی
ان خرابوں سے بھی ہو کر دیکھو

ریشۂ گُل میں بھی ہے موجۂ خوں
خار کی نوک چبھو کر دیکھو

اوس کی بوند بھی ہے شیشہ نگر
آنکھ اشکوں سے بھگو کر دیکھو

ذرّے ذرّے میں ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

شب کے سنّاٹوں میں وہ بات کہاں
دن کے ہنگاموں میں کھو کر دیکھو

تم بگولوں کے خداوند سہی
آتشِ گل تو فرو کر دیکھو

جو دیئے لے کے نکلتے ہیں فرازؔ
وہ بھی کھا جاتے ہیں ٹھوکر دیکھو

منسوبہ سے

تُو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم
وقت نے آج کسے سونپ دیا ہے تجھ کو
کس کے دامن سے ہے باندھا گیا پلّو تیرا
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم و حیا کی مہریں
تیرے ماں باپ نے کیوں نرخ ترا بول دیا
کالے بازار میں نیلام اٹھا کر تیرا
سبز باغوں کے تصوّر پہ تجھے تول دیا

جو سجائی گئی فردوس نمائش کے لئے
وہ کسی اور کی تعمیر ہے میری تو نہیں
یہ مکانات، یہ جندر، یہ دکانیں، یہ زمیں
میرے اجداد کی جاگیر ہے میری تو نہیں

میں تو آوارہ سا شاعر ہوں مری کیا وقعت
ایک دو گیت پریشان سے گا لیتا ہوں
گاہے گاہے کسی ناکام شرابی کی طرح
ایک دو زہر کے ساغر بھی چڑھا لیتا ہوں

تو کہ اک وادیٔ گل رنگ کی شہزادی ہے
دیکھ بے کار سے انساں کے لئے وقف نہ ہو
تیرے خوابوں کے جزیروں میں بڑی رونق ہے
ایک انجان سے طوفاں کے لئے وقف نہ ہو

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتۂ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ ان کہنہ رسُومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زنداں میں اُتر جائے گی

جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
لوگ آرام سے سوئے ہوں گے

بعض اوقات بہ مجبوریٔ دل،
ہم تو کیا آپ بھی روئے ہوں گے

صبح تک دستِ صبا نے کیا کیا
پھول کانٹوں میں پروئے ہوں گے

وہ سفینے جنہیں طوفاں نہ ملے
ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

رات بھر ہنستے ہوئے تاروں نے
ان کے عارض بھی بھگوئے ہوں گے

کیا عجب ہے وہ ملے بھی ہوں فراز
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے

معذرت

(ایک دوست کی شادی پر)

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی نظم کہوں
جس کے الفاظ میں پازیب کی جھنکاریں ہوں
جس کے ہر بند میں رقصاں ہوں بہاریں نغمے
جس کے شعروں میں خیابانوں کی مہکاریں ہوں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی گیت کہوں
جس کی تشبیہوں میں ہنستے ہوئے پیمانے ہوں
جس کے انداز پہ طاری ہو شرابوں کا نشہ
جس کے مفہوم میں افسانے ہی افسانے ہوں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی سہرا لکھوں
جس کی ہر لَے سے کئی گیت ہم آہنگ رہیں
جس سے جاگ اُٹھیں مغنّی کی سُریلی تانیں
جس میں افکار کی ترتیب کے سب رنگ رہیں

جن کی شادی بھی غم و رنج کا مجموعہ ہے
جن کو حاصل نہیں ہوتا کسی لمحہ بھی فراغ
جن کو ماں باپ سے ملتے ہیں مصائب کے جہیز
جن کی باراتوں میں جل اُٹھتے ہیں اشکوں کے چراغ

لیکن اس وقت مرے ذہن کے ہر پردے میں
چند سسکی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری سانسوں میں ہیں مغموم دلوں کی چیخیں
جن کی قسمت میں کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

ایسے حالات میں کیا چیز تجھے نذر کروں
یہ حقائق مجھے مجبور کئے دیتے ہیں
میرے شاہدؔ مرے اخلاص سے مایوس نہ ہو
چند صدمے مجھے معذور کئے دیتے ہیں

ع دوست کا نام

رباعی

یا اپنے رفیقانِ سفر سے کٹ جاؤ
یا سیلِ حوادث کے مقابل ڈٹ جاؤ
رستے کا غبار کیوں بنے ہو چھٹ جاؤ
جب بڑھ نہیں سکتے تو پرے ہٹ جاؤ

ہر زخم کو سینے پہ سجا لیتے ہیں
ہر درد کو ہم دِل میں بسا لیتے ہیں
تم پھولوں پہ سوتے ہو تو دُکھتا ہے بدن
ہم کانٹوں کو آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

اُداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں
فرازؔ انجمنِ دوست سے چلو جائیں

نہ اجنبی نہ مسافر نہ شہر والے ہیں
کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

جو صدمے ہم پہ گزرنے ہیں وہ تو گزریں گے
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے آپ تو جائیں

اُلجھتے ہیں ترے سودائیوں سے اہلِ خرد
یہ سادہ لوح بھی پاگل کہیں نہ ہو جائیں

زمانہ اپنی پریشانیوں میں کھویا ہے
چلو کہ منزلِ جاناں کو دوستو جائیں

شبِ فراق تو کٹتی نظر نہیں آتی
خیالِ یار میں آؤ فرازؔ سو جائیں

○

کچھ نہ کسی سے بولیں گے
تنہائی میں رو لیں گے

ہم بے راہ رَووں کا کیا
ساتھ کسی کے ہو لیں گے

خود تو ہُوئے رُسوا لیکن
تیرے بھید نہ کھولیں گے

جیون زہر بھرا ساگر
کب تک امرت گھولیں گے

ہجر کی شب سونے والے
حشر کو آنکھیں کھولیں گے

پھر کوئی آندھی اُٹھے گی
پنچھی جب پَر تولیں گے

نیند تو کیا آئے گی فرازؔ
موت آئی تو سولیں گے

سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں
وہ زخمۂ رگِ جاں توڑ کر نکلتے ہیں

حضور آپ شب آرائیاں کریں لیکن
فقط نمودِ سحر تک چراغ جلتے ہیں

اگر فضا ہے مخالف تو زلف لہراؤ
کہ بادبان ہواؤں کا رُخ بدلتے ہیں

کوئی بھی فیصلہ دینا ابھی درست نہیں
کہ واقعات ابھی کروٹیں بدلتے ہیں

یہ پاسِ پیرِ مغاں ہے کہ ضعفِ تشنہ لبی
نشہ نہیں ہے مگر لڑکھڑا کے چلتے ہیں

خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فرازؔ
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

صرّاف

ساٹھ کے تیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا
زرِ خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ
کسی پتھّر پہ رگڑ اس کو کسوٹی پہ پرکھ
ہر طرح جانچ ہر انداز ہر اک طور سے دیکھ

مجھ پہ روشن ہے کہ اس جنسِ گراں مایہ کو
میرے افلاس نے کم نرخ بنا رکھا ہے
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدّت
تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے

جانتا ہوں تری دوکاں کے یہ زرّیں زیور
یہ گلوبند یہ کنگن یہ طلائی پیسے
یہ زر و سیم کی اینٹوں سے لدی الماری
کسی شدّاد کا تابوت دھرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کیلئے
کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیئے
کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراؤ میں
پہلے تو رہن کئے بعد ازاں بیچ دیئے

تیری میزاں کے یہ بے رحم سنہرے پلڑے
ایک جلاّد کی تلوار رہے ہیں اب تک
گرسنہ آنکھوں کے کشکول، ہوس کے مقتل
ہر نئے خوں کے خریدار رہے ہیں اب تک

ساڈے کے تیں نہیں، تیں پکے تیرہ ڈے ڈے
اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا
آج اک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر
میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا

منصور

وہ کیا خطا تھی؟
کہ جس کی پاداش میں ابھی تک
میں قرن ہا قرن سے شکارِ عبودیت
طوق در گلو — پا بہ گل رہا ہوں
وہ جرم کیا تھا؟
کہ زندگی بھر تو میں
ترے آستاں پہ سجدوں کی نذر گزرانتا رہوں
اور اس کا ثمرہ ملے

تو بس کاسۂ گدائی — عذابِ عالم
تو کیا مری بے طلب ریاضت، مجاہدت کا یہی صلہ ہے
مجھے گلہ ہے
خدائے تنور و آبِ سادہ مجھے گلہ ہے
مجھے تری بندگی کے صدقے میں کیا ملا ہے
کہاں ہے وہ تیرا دستِ فیّاض
جس کے جود و سخا کے قصّے
سنہرے حرفوں میں ہر صحیفے کے
حاشیے بن کے رہ گئے ہیں
کہاں ہیں وہ تیری جنّتیں جن کی داستانیں
بڑے تکلّف سے عرش سے فرش پر اُتاریں
کہاں ہیں وہ تیرے شیر و شہد و شکر کے بے انتہا ذخیرے
کہ جن کی کاذب جھلک سے تُو نے
گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا

کہاں ہیں ان واہمی کھلونوں کے
اونچے بازار کس طرف ہیں
میں ان روایات کی حقیقت سے باخبر ہوں
یہ سب وہ رنگین دام تھے جن کے بل پہ تو نے
زمیں پہ بغض و عناد و ظلم و فساد و حرص و ہوس کے ایسے دھوئیں اڑائے
کہ نسلِ آدم کروڑ فرقوں میں بٹ گئی ہے
یہ وحدۂ لاشریک دنیا ہزار خطوں میں کٹ گئی ہے

اگرچہ روزِ الست سے لے کے اب تلک
بے شمار صدیوں کے فاصلے ہیں
مگر یہ تاریخ کی کہن سال راہبہ، جو
ترے کلیساؤں، بتکدوں اور حرم سراؤں کے مجرمانہ
رموز سے آشنا رہی ہے
ہر اک خرابے کی خاک اڑانے کے بعد آئی

تو کہہ رہی ہے

"سنو نشیبوں کے باسیو!
یہ جہاں تمہارا ہے
یہ زمیں، یہ فلک، یہ خورشید و ماہ و انجم فقط تمہارے ہیں
دوسرا ماسوا تمہارے کوئی نہیں ہے
خدا و بندہ کی تلخ تفریق بے حقیقت ہے بے سبب ہے
الوہیت کا وجود تم میں سے ہی کسی خود فریب انساں کا واہمہ تھا

یہ واہمہ اس قدر بڑھا پھر
کہ رفتہ رفتہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے
اور اس خداوند
اس تصوّر کے آسرے پر
تمہارے کچھ ہم نفس رفیقوں نے

تم کو محکوم و پا بہ زنجیر کر دیا ہے
یہی وہ پہلا گناہ، پہلا فریب، پہلا فسوں ہے جس نے
مزاجِ انساں کو غاصبانہ شعور بخشا"

اگر یہ سچ ہے!
اگر یہ سچ ہے خدائے تنور و آبِ سادہ
تو یہ من و تو کی پست و بالا فصیل مسمار کیوں نہ کر دوں
کہ ان مراتب کی کشمکش سے ہی
آج میں اور میرے ہم جنس
اس طرح ایک دُوسرے کے غنیم ہیں
جس طرح زمستاں کی برف باری کے بعد گرگان گرسنہ
بھوک کی شقاوت سے تنگ آ کر
اس ایک لمحے کے منتظر ہوں
جب ان کا کوئی نحیف ساتھی

غنودگی کا شکار ہو

اور سب کے سب اس پہ ٹوٹ کر چیر پھاڑ ڈالیں

کہ اس شکم کے مہیب دوزخ سے بڑھ کے

کوئی نہیں جہنّم

نہ اِس جہاں میں

نہ اُس جہاں میں

رباعی

مذہب کو مدام بیچتے ہیں یہ لوگ
ایمان تو عام بیچتے ہیں یہ لوگ
جنّت کے اجارہ دار بن کر شب و روز
اللہ کا نام بیچتے ہیں یہ لوگ

تھک جائیں گے راہگیر چلتے چلتے
ڈھل جائیں گے ماحول میں ڈھلتے ڈھلتے
تاریکیٔ شب میں نہ کمی آئے گی
بجھ جائیں گے یہ چراغ جلتے جلتے۔

مشورہ

زیست کی تلخیوں سے گھبرا کر
اپنا دامانِ عجز پھیلا کر
آسماں کی طرف نگاہ کیے
اپنے ربِّ کریم کے در سے
موت کی بھیک مانگنے والے!
دیکھ اس زرنگار مسجد کو
آبِ زرّیں کی جھلملاہٹ سے
جس کے مینار جگمگاتے ہیں

تیرے ربِّ کریم کا گھر ہے
اور اس خانۂ مقدس میں
مئے کوثر کے خم لنڈھائے ہوئے
شوخ غلماں لگائے سینے سے
ملک الموت نیم خوابیدہ
یادِ ربِّ کریم میں گُم ہیں

چھوڑ انداز یہ دعاؤں کا
تا بہ کَے آسرا خداؤں کا
ہاں فقط ایک نعرۂ وحشت
بڑھ فقط اک قدم بغاوت کا
یا تو یہ خیر د شر کے رکھوالے

موت کی بھیک تجھ کو دے دیں گے
یا پھر ان کے مہیب پنجوں سے
چھین کر اپنی زندگی پا لے
موت کی بھیک مانگنے والے

○

غیر سے تیرا آشنا ہونا
گویا اچھا ہُوا بُرا ہونا

خود نگوں سار، ہمسفر بیزار
اک ستم ہے شکستہ پا ہونا

کتنی جانکاہ ہے ضمیر کی موت
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا

نشۂ لذّتِ گناہ کے بعد
سخت مشکل ہے پارسا ہونا

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

دل کی باتوں پہ کون جائے فرازؔ
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا

رباعی

روتا ہوں تو احباب بُرا مانتے ہیں
ہنستا ہوں تو مجرم مجھے گردانتے ہیں
ہر حال میں اعتراض کرنے والے
ناداں مرے حالات کہاں جانتے ہیں

زہرابِ حیات چکھ رہا ہوں دیکھو
کانٹوں پہ زبان رکھ رہا ہوں دیکھو
واقف ہوں طبیعتوں سے انکی پھر بھی
احباب کے دل پرکھ رہا ہوں دیکھو

○

تیرے ہوتے ہُوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دُور ہوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھڑک اُٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پر روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دُنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بیدرد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فرازؔ
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

آگ میں پھُول

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں مرے پاس نہ آ
اپنے دامن میں محبّت کے حسیں پھول لئے
ان دلآویز بہاروں سے مجھے ربط نہیں

جب کوئی تازہ کلی نکہت و رنگت کی پلی
شبنمی حسن کے سیمیں لبادے اوڑھے
مست پلکوں پہ لئے صبح جوانی کی پھوار
میرے تپتے ہوئے ماحول میں در آتی ہے

تو مرے سرد ارادوں سے دُھواں اُٹھتا ہے
میری آنکھوں میں الاؤ سے دہک جاتے ہیں
اور اس آتش و ظلمت کے گھنے لاڑے میں
مسکراتی ہوئی شاداب کلی کی سانسیں
چند ہی لمحوں میں رُک جاتی ہیں پھک جاتی ہیں
تو کہ تو بھی ہے کسی ذوقِ نمو سے سرشار
مست پلکوں پہ لئے صبح جوانی کی پھوار

ایک انجان سی منزل کو بڑھے آتی ہے
دیکھ اس شعلوں کی بستی کو ذرا غور سے دیکھ
ہر قدم پر جہاں انگارے ہی انگارے ہیں
تو یہاں رہ کے کبھی پھول نہیں بن سکتی
لوٹ جا پیشتر اس کے کہ ترے ہونٹوں میں

احمریں رس کی جگہ تند شررِ گھل جائیں
ان مہکتے ہوئے رخساروں کے زرخیز کنول
آگ کے حلقۂ بے باک میں جھلسے جائیں

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں ....

رباعی

حالات کی دوپہر کڑی ہے ساقی
تقدیر برہنہ سر کھڑی ہے ساقی
کچھ دیر غمِ جہاں پہ ہنس لیں آؤ
رونے کو تو زندگی پڑی ہے ساقی

دُنیا تو ہے کانٹوں کا بچھونا پیارے
تم ہم سے کبھی جُدا نہ ہونا پیارے
آؤ مل کر دُکھ کے لمحے کاٹیں
اک جشن ہے ساتھ ساتھ رونا پیارے

بڑھ جاتا ہے دل کا روگ گا ہے گا ہے
کر لیتے ہیں اپنا سوگ گا ہے گا ہے
جو یاد دلا دیتے ہیں بھُولے صدمے
مل جاتے ہیں ایسے لوگ گا ہے گا ہے

میری حالت ہے کہ احساسِ طرب ہے کوئی
تیرے بے ساختہ ہنسنے کا سبب ہے کوئی

فتنۂ گردشِ دوراں ذرا آہستہ گزر
سایۂ زلف میں آرام طلب ہے کوئی

اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ تقریبِ طرب ہے کوئی

آج تک ان سے رہ و رسم چلی جاتی ہے
جن سے کچھ پہلے توقع تھی نہ اب ہے کوئی

یا تجھے دیکھ کے بھر آئے خوشی سے آنسو
یا مری آنکھوں میں گزری ہوئی شب ہے کوئی

جانے کن لوگوں کی بستی میں چلے آئے فرازؔ
آبدیدہ ہے کوئی خندہ بلب ہے کوئی

اب جو کانٹے ہیں دل میں تمنّاؤں کے پھول تھے
آج کے زخم پہلے شناساؤں کے پھول تھے

دشتِ غربت کچھ ایسا ہوا گلفشاں گلفشاں
جس طرح پھوٹتے آبلے پاؤں کے پھول تھے

تھی ہمیں کو بہت خار زارِ جنوں کی لگن
دوستو! ورنہ اقوال داناؤں کے پھول تھے

غم کی لَو سے دھڑکتے دلوں کے کنول بجھ گئے
دھوپ میں کیسے کھلتے وہ جو چھاؤں کے پھول تھے

برف زاروں میں کوئی اگر یہ سماں دیکھتا
جا بجا نقشِ پا کوہ پیماؤں کے پھول تھے

شہر میں حسنِ سادہ کو کانٹوں میں تولا گیا
بک گئے کوڑیوں مول جو گاؤں کے پھول تھے

زہر آگیں فضا بستیوں کی جنہیں کھا گئی
ہم فرازؔ ایسے سنسان صحراؤں کے پھول تھے

○

سکوتِ شامِ خزاں ہے قریب آ جاؤ
بڑا اداس سماں ہے قریب آ جاؤ

نہ تم کو خود پہ بھروسہ نہ ہم کو زعمِ وفا
نہ اعتبارِ جہاں ہے قریب آ جاؤ

رہِ طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں
ہجومِ ہمسفراں ہے قریب آ جاؤ

جو دشتِ عشق میں بچھڑے وُہ عمر بھر نہ ملے
یہاں دُھواں ہی دُھواں ہے قریب آجاؤ

یہ آندھیاں ہیں تو شہرِ وفا کی خیر نہیں
زمانہ خاک فشاں ہے قریب آ جاؤ

فقیہہِ شہر کی مجلس نہیں کہ دُور رہو
یہ بزم پیرِ مغاں ہے قریب آ جاؤ

فرازؔ دُور کے سُورج غروُب سمجھے گئے
یہ دَورِ کم نظراں ہے قریب آ جاؤ

رباعی

ہر بحرِ ستم کو پاٹ لینے والا
ہر زہرِ الم کو چاٹ لینے والا
ذرّے سے پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے
انساں پہاڑ کاٹ لینے والا

آشوبِ گہہِ حیات لے ڈوبیں گے
دُنیا کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے
ہم لوگ عبارت ہیں زمانے جن سے
ڈوبیں گے تو کائنات لے ڈوبیں گے

جانشین

(۱۹۵۲ء میں کراچی میں طلباء پر فائرنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

علم و دانش کے سوداگروں نے کہا
جاہلو!
تم اندھیروں کی دُنیا کے باسی
جہالت کی تاریک غاروں کے مُردے
کہاں جا رہے ہو، کہاں؟
تم تہی دست ہو
تم تہی جیب ہو

تم تہی دامنوں سے ہمیں کوئی لالچ نہیں
تم نہیں جانتے
تم نہیں مانتے
ہم تمہارے لئے
کب سے تہذیب و حکمت کی نایاب اجناس کو
منڈیوں میں سجائے ہوئے ہیں
تم نہیں دیکھتے
تم کہ شب کور ہو
ہم نے دن کے اُجالے میں بھی بس تمہارے لئے
اس تمدّن کے فانوس روشن کیے
جن کی شفاف کرنوں سے سارا جہاں بقعۂ نور ہے
عالمِ طور ہے
پاگلو!

تم نہیں جانتے
تم نہیں مانتے
ہم ارسطو ہیں شاہوں کے اُستاد ہیں
ہم فلاطوں ہیں ہم کو ہر اک علم و حکمت کے گُر یاد ہیں
ہم ہی سقراط ہیں
ہم ہی بقراط ہیں
ہم ہی بے مثل شخصیّتوں کے خرد مند فرزند ہیں
ہم ہی کون و مکاں کے خداوند ہیں
سر پھر و !
تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمہیں
خاک و خوں کے سمندر میں نہلا دیا
صرف اپنے تسلّط کی خاطر تمہیں
ہم نے اپنوں کے ہاتھوں سے کٹوا دیا

چاند سُورج تو اپنے لئے رکھ لئے
اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا
تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں
یہ تسلّط یہ جاہ و حشم یہ زمیں
بس تمہارے لئے ہے تمہارے لئے
دورِ فردا کے فرمانروا ہو تمہیں
تم کو ہونا ہے اجداد کا جانشیں

پاگلو !

ہم سے عالی نظر دیدہ ور
تم سے جو بھی کہیں مان لو
اپنے اپنے مراتب کو پہچان لو
تم نہیں جانتے۔ تم کہ مردہ رہے سال ہا سال سے
بھیڑیوں اور درندوں کی ارواحِ بد تم میں در آئی ہیں

اور جہل و جنوں کی نجس مشعلیں دے کے تم کو
بغاوت پہ اُکساتی ہیں
اپنے اجداد سے۔ اپنے فرمانرواؤں سے آقاؤں سے
جاہلو!
پاگلو!!

راتیں ہیں اُداس دن کڑے ہیں
اے دل ترے حوصلے بڑے ہیں

اے یادِ حبیب ساتھ دینا
کچھ مرحلے سخت آ پڑے ہیں

رُکنا ہو اگر تو سو بہانے
جانا ہو اگر تو راستے بڑے ہیں

اب کیسے بتائیں وجہِ گریہ
جب آپ بھی ساتھ رو پڑے ہیں

اب جانے کہاں نصیب لے جائے
گھر سے تو فرازؔ چل پڑے ہیں

سیلاب

پھر تم ہاتھوں کو پھیلاؤ　　آیا ہے سیلاب
ناچو گاؤ جشن مناؤ　　آیا ہے سیلاب

قدرت کے سب کھیل نیارے
اس میں کسی کو دخل نہیں ہے
جس کو ڈبوئے جس کو ابھارے

چھوڑو ناؤ خوف نہ کھاؤ　　دور نہیں گرداب
ناچو گاؤ جشن مناؤ　　آیا ہے سیلاب

کٹیاؤں کو بہہ جانے دو
مال مویشی سب کچھ چھوڑ دو
نام خدا کا رہ جانے دو
ہاتھ اٹھاؤ ڈوبے جاؤ چھوڑ دو مال اسباب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب
پھٹے پرانے کپڑے پہنو
اپنا مقدّر۔ اپنا نصیبہ
دیکھتی جاؤ۔ ننگی بہنو
ننگی ماؤ۔ بُنتی جاؤ اطلس اور کمخواب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب
تم ہو جیون بھر کے روگی
یہ جگ چھوڑ و اُس دُنیا میں
تم پہ خدا کی رحمت ہو گی

پھول اُگاؤ پتھر کھاؤ گندم ہے نایاب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

ہنس ہنس کر اے غربت زادو
اُن داتاؤں کے چرنوں میں
اپنی جانیں بھینٹ چڑھا دو

بڑھتے آؤ روگ مٹاؤ ہو جاؤ غرقاب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

○

لے اُڑا پھر کوئی خیال ہمیں
ساقیا ساقیا سنبھال ہمیں

رو رہے ہیں کہ ایک عادت ہے
ورنہ اتنا نہیں ملال ہمیں

خلوتی ہیں ترے جمال کے ہم
آئینے کی طرح سنبھال ہمیں

مرگِ انبوہ جشنِ شادی ہے
مل گئے دوست حسبِ حال ہمیں

اختلافِ جہاں کا رنج نہ تھا
دے گئے مات ہم خیال ہمیں

کیا توقع کریں زمانے سے
ہو بھی گر جراٴتِ سوال ہمیں

ہم یہاں بھی نہیں ہیں خوش لیکن
اپنی محفل سے مت نکال ہمیں

ہم ترے دوست ہیں فرازؔ مگر
اب نئی اُلجھنوں میں ڈال ہمیں

○

ہم ہیں ظلمت میں کہ اُبھرا نہیں خورشید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے

کون سُنتا تھا حدیثِ غمِ دل یُوں تو مگر
ہم نے چھیڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

پی گئے رند کہ نایاب ہے صہبا ورنہ
زہر تھی محتسبِ شہر کی تنقید اب کے

تشنگی وجہِ جنوں ہے تو چلو یُوں ہی سہی
کوئی سنگ آئے پئے ساغرِ جمشید اب کے

اک زمانے سے نہ روئے ہیں نہ جاں تڑپی ہے
دل پہ لازم ہے ترے درد کی تجدید اب کے

قصۂ اہلِ وفا جانے کہاں تک پہنچے
منزلِ دار و رسن ٹھہری ہے تمہید اب کے

لہُو روئے ہیں تو گلنار شفق پھُوٹے گی
آنسُو بوئے ہیں تو ہم کاٹیں گے خورشید اب کے

ہم نے یہ سوچ کے جاں دی ہے محبت میں فرازؔ
بوالہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اب کے

۲۳ مارچ

(جشنِ جمہوریہ پاکستان کے موقع پر لکھی گئی)

"خوشا یہ ساعتِ رنگیں خوشا یہ روزِ طرب
ستم کشو! نئی منزل کا احترام کرو
اُداس چہروں سے گردِ ملال دھو ڈالو
ملول رُوحوں کو ہنس ہنس کے شاد کام کرو
درُونِ خانہ گھنی ظلمتیں سہی لیکن
بڑے خلوص سے تزئینِ سقف و بام کرو
چراغ ہوں کہ لہو ہو کہ آنسوؤں کی لکیر
پھر آج جشنِ بہاراں کا اہتمام کرو

شبِ الم کی حکایات کا یہ وقت نہیں
اُٹھو اور اُٹھ کے نئی صبح کو سلام کرو"

امیرِ شہر کے فرمان سب بجا لیکن
فقیرِ شہر بھی کچھ عرضِ حال کرتے ہیں
خطا معاف بصد احترام عہدِ وفا
سسکتے ہونٹ، دکھے دل سوال کرتے ہیں
کہ ہم تو وُہ ہیں جو بادِ صف ضعفِ تشنہ لبی
مزاجِ پیرِ مغاں کا ملال کرتے ہیں
ہر ایک تیر کو خوش آمدید کہتے ہوئے
دو چند اہلِ حشم کا جلال کرتے ہیں
ہمیں تو جاں سے زیادہ عزیز دردِ وطن
مگر حضُور بھی ایسا خیال کرتے ہیں

چمن میں جشنِ ورودِ بہار جب بھی ہوا
وطن میں جب بھی فروزاں ہوئے خوشی کے دیے
رہی ہے بوالہوسوں کے سبو میں بادۂ ناب
بلاکشانِ وفا نے لہو کے گھونٹ پیے

مہ و نجوم رہے بزمِ شہر یاراں میں
نگاہِ خلق ترستی رہی کرن کے لیے
ادھر عبا و قبا کا خیال دامن گیر
ادھر یہ فکر کہ کوئی جگر کے چاک سیے
تو کیا یہی غمِ جمہور کے تقاضے ہیں
نظر اُٹھا کے نہ دیکھیں کوئی مرے کہ جیے

رہے نصیب جو اب بھی غمِ مآل رہے
یہ دورِ نو ہے مبارک اگر سنبھل کے چلیں

یہ چند سانسوں کی فرصت بڑی غنیمت ہے
کسے خبر ہے کہ پھر حادثے ٹلیں نہ ٹلیں
خدا وہ وقت نہ لائے کہ گردشوں کے طفیل
حضورؐ اپنی جفا کیشیوں پہ ہاتھ ملیں
جو ہو سکے تو مٹا دیں یہ فاصلے ورنہ
کہیں یہ ذرّے ستاروں سے انتقام نہ لیں
بجھے ہوں دل تو اندھیرے کبھی نہیں مٹتے
یہ قمقمے تو کجا لاکھ آفتاب جلیں

○

دل کو اب یُوں تری ہر ایک ادا لگتی ہے
جس طرح نشّے کی حالت میں ہوا لگتی ہے

رتجگے خواب پریشاں سے کہیں بہتر ہیں
لرز اُٹھتا ہُوں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے

اے رگِ جاں کے مکیں تو بھی کبھی غور سے سُن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

گو دُکھی دل کو بہت ہم نے بچایا پھر بھی
جس جگہ زخم ہو واں چوٹ سدا لگتی ہے

شاخِ اُمّید پہ کھلتے ہیں طلب کے غنچے
یا کسی شوخ کے ہاتھوں میں حنا لگتی ہے

تیرا کہنا کہ ہمیں رونقِ محفل ہیں فرازؔ
گو تعلّی ہے مگر بات خدا لگتی ہے

○

ہم اپنے آپ میں گُم تھے ہمیں خبر کیا تھی
کہ ماورائے غمِ جاں بھی ایک دُنیا تھی

وفا پہ سخت گراں ہے ترا وصالِ دوام
کہ تجھ سے مل کے بچھڑنا مری تمنّا تھی

ہُوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تُو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دُنیا تھی

خوشا وہ دل جو سلامت رہے بزعمِ وفا
نگاہِ اہلِ جہاں ورنہ سنگِ خارا تھی

دیارِ اہلِ سخن پر سکوت ہے کہ جو تھا
فراز میری غزل بھی صدا بصحرا تھی

تفاوت

تو کیوں ہے اُداس، مسکرا دے
کیوں تجھ کو غمِ وفا نے گھیرا
زنگارِ الم سے دُور ہی رہ
آئینہ صفت جمال تیرا
کتنی ہی سیاہ شب ہو لیکن
کب چاند پر چھا سکا اندھیرا
کب موجۂ روشنی تھمی ہے
دریاؤں پہ دُھول کب جمی ہے

میں کیسے ہنسوں کہ دردِ ہستی
ہے میرے شعور کا تقاضا
حالات کی دُھوپ میری قسمت
آلام کی ریگ میری دُنیا
میں سایۂ نخل کو بھی ترسوں
صحرا کی طرح وجود میرا
صحراؤں میں پھول کب کھلے ہیں
ہم دونوں میں کتنے فاصلے ہیں

○

اب تک تیرے فتنے ہیں سلامت اُسے کہنا
یارو! سرِ محشر بھی قیامت اُسے کہنا

اے ہمنفسو محوِ غمِ جاں ہیں ابھی ہم
آئیں گے سرِ کوئے ملامت اُسے کہنا

معیارِ نظر دار کی رفعت بھی تھی لیکن
بھولا نہیں تیرا قد و قامت اُسے کہنا

اک وُہ ہی نہیں ترکِ تعلق پہ پشیماں
ہے اہلِ وفا کو بھی ندامت اُسے کہنا

اے دل زدگاں! موت ہے اظہارِ تمنّا
وُہ بُت ہو خدا بھی تو خُدامت اُسے کہنا

ہر چند فرازؔ ان دنوں معتوب ہے پھر بھی
حالات کا مارا ہے بُرا مت اُسے کہنا

تسلسل

کب سے سنسان خرابوں میں پڑا تھا یہ جہاں
کب سے خوابیدہ تھے اس وادیٔ خارا کے صنم
کس کو معلوم یہ صدیوں کے پُر اسرار بھرم
کون جانے کہ یہ پتھر بھی کبھی تھے انساں
صرف لب دوختہ پربت ہوں جہاں نوحہ کناں

نہ درو بام نہ دیوار و دریچہ کوئی
کوئی دہلیز شکستہ نہ حریمِ ویراں

شہر کے شہر ہیں پاتال کے دامن میں نہاں
کون پہچانتا ظلمت میں سیاہی کے نشاں
جو نظر ڈھونڈھنے اُٹھی وہ نظر بھی کھوئی
چشمِ مہتاب بھی شبنم کی جگہ خوں روئی

یہ خرابے تھے ان ادوار کے مدفن جن میں
ارضِ مشرق کے جہاں تاب اُجالوں کی نمود
جگمگاتی رہی تاریخ کا تاریک وجود
رات ہوتی رہی تبدیل چمکتے دن میں
اَن گنت صدیوں کی تہذیب پنپتی ان میں

علم نے آج کر دیے ہیں وہ ظلمات کے ڈھیر
وقت نے جن پہ بٹھائے تھے فنا کے پہرے
جاگ اُٹھے صورِ سرافیل سے گونگے بہرے

تا ابد جن کے مقدّر میں تھی دُنیا اندھیر
یہ مگر عظمتِ انساں ہے کہ تقدیر کے پھیر؟

یہ عمارات، یہ مینار، یہ گلزار، یہ کھیت
تودۂ خاک سے ہستی نے لیا تازہ جنم
جی اُٹھے وادئ خاموش کے بے جان صنم
پھر کوئی چھیڑے گا ذرّے کا جگر قطرۂ یم
دفن کر دے گا جو خالق کو بھی مخلوق سمیت

○

چاندنی رات کو سحر کہنا
دوستو! یوں نہیں مگر کہنا

اب کہاں وُہ بہار پھولوں کی
گُلِ نرگس کو چشمِ تر کہنا

بجھ چکے ہیں محبّتوں کے چراغ
ان دیاروں کو اب کھنڈر کہنا

راہ میں لٹ کے بیٹھنے والو
اب کسی کو نہ ہمسفر کہنا

خود اُجاگر کرو، ہنر اپنا
دوسروں کو نہ کم نظر کہنا

ق
ہم کو آوارگی کے پردے میں
دِل کی باتیں اِدھر اُدھر کہنا

ذکر تیرا گلی گلی کرنا
حال اپنا نگر نگر کہنا

لبِ گویا عذابِ جاں ہے فرازؔ
جو بھی کہنا ہو سوچ کر کہنا

ہلالِ عید

ہلالِ عید ! نویدِ طرب ہے دید تری
تری نمود خوشی کا پیام لاتی ہے
بجھی نگاہوں میں کرنوں کی جوت بھرتی ہے
ملول رُوحوں کی افسردگی مٹاتی ہے
روائتیں ہیں کہ اس دن ہر ایک دل کی کلی
دفورِ نشۂ راحت سے جھُوم جاتی ہے
بلند و پست کے ہر تفرقے مٹاتے ہوئے
ہر اک محل میں ہر اک گھر میں عید آتی ہے

ہلالِ عید! مگر میں نے ہر برس دیکھا
کہ تیری ضو بھی نشیبوں میں مسکراتی نہیں
روایتوں پہ مجھے بھی یقیں تو ہے لیکن
یہ خوش عقیدگی کیا کیجے راس آتی نہیں
خدا کے گھر میں برابر سبھی غریب و غنی
یہ رسم ملکِ خدا میں رواج پاتی نہیں
طلوع ہوتا رہا تو ہر اک سال مگر
مرے وطن کی جبیں پھر بھی جگمگاتی نہیں

ہلالِ عید! تفاوت کی آتشیں آندھی
جھلس رہی ہے میرے دیس میں خوشی کے چمن
کہیں تو جسم پہ ریشم کے ڈھیر بار نظر
کہیں بدن پہ ہیں عریانیاں ہی پیراہن

کہیں تو کجکلہی وجہِ نخوت و تمکیں
کہیں فلاکت و افلاس زندگی کے کفن
کہاں وُہ دن کہ غریب الدیار روتے تھے
یہ حال ہو تو وطن میں ستم ہے عیدِ وطن

ہلالِ عید! تجھے غمزدوں سے کیا نسبت
کہ خواجگانِ جہاں ہی ترے چہیتے ہیں
جو تیرے نام کے ساغر فضا میں لہرا کر
تری کمان کی قوسوں کو موڑ دیتے ہیں
فغاں! کہ تجھ کو بھی ان بےکسوں سے ربط نہیں
جو اپنے دل کے سفینے لہُو میں کھیتے ہیں
تیری ضیا بھی ہے گویا کٹی پتنگ جسے
بلند بام خلا ہی میں لوٹ لیتے ہیں

ہلالِ عید! طرب زا سہی یہ شام مگر
چراغِ شوق جلاتے ہوئے لرزتے ہیں

دلوں پہ کل جو قیامت گزرنے والی ہے
اب اس کا دھیان بھی لاتے ہوئے لرزتے ہیں

ہم اہلِ غم تجھے خوش آمدید کیسے کہیں
جو اپنے دُکھ بھی سُناتے ہوئے لرزتے ہیں

اگرچہ تجھ پہ نگاہیں جمی ہُوئی ہیں مگر
دُعا کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے لرزتے ہیں

○

جانے کس غم سے من سلگتا ہے
بات کرتے دھن سلگتا ہے

غم لگاتا ہے آگ خلوت میں
دل سرِ انجمن سلگتا ہے

احمریں جسم آنچ دیتا ہوا
جس طرح پیرہن سلگتا ہے

یہ طلب ہے کہ دردِ محرومی
ابر چھائے تو بن سلگتا ہے

دیکھنا لُو چلی کہ با مُراد
دوستو پھر چمن سلگتا ہے

جاگ اُٹھی خواہشِ گناہ فراز
چاندنی میں بدن سلگتا ہے

واہمہ

تو ہر ایک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور مَیں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تری سادہ و معصوم ہنسی
آنکھ کی بھول، سماعت کا فسوں
تیری عادت ترا انداز نہ ہو
بے تکلّف ترے ہونٹوں کی چٹک
میری خوش فہمی کا اعجاز نہ ہو
میں سرابوں کو بھی دریا سمجھوں
تو فقط شوق کی پرواز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تری سادہ و بے باک ہنسی
میں جسے خواب سے تعبیر کروں
وہ حقیقت میں کوئی راز نہ ہو
تیرے بے ساختہ ہنسنے کی ادا
تیری تنہائی کی آواز نہ ہو
میں جسے حسنِ طبیعت جانوں
تیرے جذبات کی غمّاز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تیری سادہ و پرکار ہنسی
میری دُنیا مری ہستی کا سکوں

کسی طوفان کا آغاز نہ ہو
میں محبّت کی طلب کا مارا
تو فقط حسنِ نظر باز نہ ہو
یہ نہ ہو میں تو سوئمبر جیتوں
اور ترے قصر کا در باز نہ ہو

ایک شعر

جسم بلور سا نازک ہے جوانی بھرپور
اب کے انگڑائی نہ ٹوٹی تو بدن ٹوٹے گا

○

یہ میں، یہ کوئے دار، یہ تنہائی دوستو
کیا تم بھی بن گئے ہو تماشائی دوستو

پیغامِ مرگ ہے کہ پیامِ حبیب ہے
صرصر چلی کہ بادِ مراد آئی دوستو

یہ کیا کہ ایک تیرِ ملامت نہ سہہ سکے
ہونی ہے کو بکو ابھی رسوائی دوستو

آغازِ شامِ ہجر ہے بیٹھے رہو ابھی
ٹھہرو ذرا کہ موت ہے تنہائی دوستو

زنجیر کٹ گئی کہ کوئی دوست کٹ گیا
کچھ تو کہو یہ کیسی صدا آئی دوستو

اک بار اس کو میری نگاہوں سے دیکھ لو
پھر خود کہو کہ کون ہے سودائی دوستو

وُہ حسنِ دلفروز کہ جانِ فرازؔ ہے
خلقِ خدا ہے اس کی تمنائی دوستو

کنیز

حضور آپ اور نصف شب مرے مکان پر
حضور کی تمام تر بلائیں میری جان پر
حضور خیریت تو ہے حضور کیوں خموش ہیں
حضور بولئے کہ وسوسے وبالِ ہوش ہیں
حضور ہونٹ اس طرح سے کپکپا رہے ہیں کیوں
حضور آپ ہر قدم پہ لڑکھڑا رہے ہیں کیوں
حضور آپ کی نظر میں نیند کا خمار ہے
حضور شاید آج دشمنوں کو کچھ بخار ہے

حضور مسکرا رہے ہیں میری بات پر
حضور کو نہ جانے کیا گماں ہے میری ذات پر

حضور مُنہ سے بہہ رہی ہے پیک صاف کیجیے
حضور آپ تو نشے میں ہیں معاف کیجیے

حضور کیا کہا میں آپ کو بہت عزیز ہوں
حضور کا کرم ہے ورنہ میں بھی کوئی چیز ہوں

حضورُ چھوڑیئے ہمیں ہزار اور روگ ہیں
حضور جائیے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں

آتشِ عجم

شبِ سیہ کے اُمڈتے ہُوئے اندھیروں میں
دل و نظر نے امیدوں کے کتنے خواب بُنے
خرد کے ہاتھ میں جب آخری چراغ بجھا
جنوں نے عزم کے ذرّوں سے آفتاب چُنے

ہوس کی تیرہ نگاہوں کے رینگتے سائے
بڑھے تو بجھتے شراروں نے آگ برسائی
فضا نے جب بھی ارادہ کیا کچلنے کا
تو ڈوبتی ہوئی نبضوں میں برق لہرائی

خیال تھا کہ اگر تُند آندھیاں بھی اُٹھیں
تو ذرّے سُرخ بگولوں کا رُوپ لے لیں گے
ہزار بادِ مخالف کا زور ہو لیکن
سفینے شدّتِ طوفاں کو مات دے دیں گے

حیات، دست و گریباں ہوئی قضا سے مگر
ہزار سانپ نکل آئے آستینوں سے
بہت قریب تھی ساحل کی روشنی لیکن
سفینے جھُوم کر ٹکرا گئے سفینوں سے

اس اختلافِ بہم کی کڑی کشاکش میں
وہ ولولے وہ شرر سرد ہو گئے آخر
وہ ذرّے جن کو فضاؤں میں رقص کرنا تھا
بگولے بن نہ سکے گرد ہو گئے آخر

یہ ایں ہمہ نہ رُکے گی اس انقلاب کی رو
اس انقلاب کی ضو تیرگی مٹائے گی
جو آگ تیل کے چشموں کو چھو کے گزری ہے
سمندروں کی تہوں کو بھی چیر جائے گی

احمد فراز کی

دیگر تصانیف

- جاناں جاناں
- دردِ آشوب
- نایافت
- شب خوں
- میرے خواب ریزہ ریزہ